© rasailojaraid.com

چوتھی قسط

قادیانیوں کا صد سالہ جشن......حقیقت کے آئینے میں

پروفیسر خالد شبیر احمد

مرزا بشیر الدین محمود کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا سیاسی و تاریخی پس منظر:

بیسویں صدی کا اختتام ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا لیکن انیسویں صدی کا اختتام اور بیسویں صدی کا آغاز ہم نے کتابوں میں پڑھا اور اپنے بزرگوں سے سنا۔ یہ اختتام و آغاز ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے کسی بھی لحاظ سے حوصلہ افزاء نہیں تھا۔ حوصلہ شکن، دلخراش اور ناگفتہ بہ سیاسی، معاشرتی، تعلیمی حالات مسلمانانِ ہند کے سروں پر منڈلا رہے تھے جیسے کسی نعش پر گدھ۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں کی جملہ حکمت عملیوں کا بنیادی نکتہ صرف ایک تھا کہ مسلمانوں کو جنگ آزادی کی سزا ملے۔ اور ان کا جذبہ حُریت و جہاد سرد خانے کی نذر ہو کر رہ جائے۔ قادیانیت کا کھڑاک بھی اس لیے رچایا گیا کہ مسلمانوں میں جذبۂ جہاد ختم ہو، مسلمانوں کا ملی تشخص مجروح اور بین الاقوامی سطح پر مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی راہیں مسدود کر کے رکھ دی جائیں۔ ویسے بھی جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو آندھی اور سیلاب کی طرح اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ہندو ہم سے بہتر تھے کیونکہ وہ جنگِ آزادی میں ہمارے معاون تو کسی حد تک تھے، محرک نہیں تھے۔ انھیں یہ بھی فائدہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی غلامی سے انگریزوں کی غلامی میں آ گئے، غلام تھے، غلام رہے۔ ہم حکمرانی سے غلامی تک پہنچے اور انگریزوں کے ہاں موردِ الزام اور گردن زنی ٹھہرے۔ اس لیے ہماری حالت کو ہی دگرگوں ہونا تھا۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالؔی جب ۱۸۶۹ء میں ”مسدس حالی“ لکھی تو یہ کتاب بھی مسلمانوں کی زبوں حالی کا ہی مرثیہ تھی:

نہ ثروت ہی ان کی قائم نہ عزت　　گئے چھوڑ ساتھ ان کا اقبال و دولت
ہوئے علم و فن ان سے ایک ایک رخصت　　مٹی خوبیاں ساری نوبت بہ نوبت
ہوئے زیورِ آدمیت سے عاری　　معطل ہوئیں قوّتیں ان کی ساری

ہندوستانی مسلمانوں کی اس وقت کی تاریخ کا ایک انتہائی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سیاسی طور پر مفلوج ہو کر رہ گئے۔ قدم قدم پر انگریزوں کی اطاعت کا دم بھرنے لگے۔ اور یوں معلوم ہوتا کہ گویا وہ انگریزوں کی اطاعت پر راضی ہو گئے ہوں انھوں نے قرآنی آیات سے انگریزوں کی اطاعت کا جواب تلاش کرنا شروع کر دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمان اگرچہ، جرأت اور بہادری میں دوسری اقوام سے بہت آگے تھے۔لیکن انگریز کے جبر وتشدد جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران ان پر انگریزی فوج کی جانب سے روا رکھا گیا اور وہ ظلم وستم جو اس دوران ان پر ڈھائے گئے ان سے مسلمانوں کے قواء مضمحل اور دماغ مفلوج ہوکر رہ گئے تھے۔۱۹۰۱ء میں مسٹر حامد علی خاں بیرسٹر کی کوٹھی پر مسلمانوں کا ایک اجلاس ہوا، جس کی صدارت سید محمد شرف الدین بیرسٹر نے کی اور مقررین میں نواب وقار الملک شامل تھے جنھوں نے جلسے کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔'' آج مسلمانوں کو اپنے تمدنی اور سیاسی معاملات کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کو اس عقیدے پر پختہ کرے کہ ان کی سود و بہبود کا راز ہندوستان کے اندر انگریزی راج کے استحکام اور دوام میں ہے۔'' چنانچہ اس وقت کے مسلمانانِ اربابِ علم اور احبابِ فکر نے انگریزوں کے ساتھ تعاون کی حکمت عملی اختیار کی۔اس نوع کے تمام لوگ صاحبِ حکمت تو ضرور تھے لیکن ان کی سیاست کا دائرہ انگریزوں کی تابعداری کا یقین دلانے اور ان کی خدمت میں عرضداشت پیش کرنے تک ہی محدود تھا۔ یہ تمام حضرات اگرچہ قومی عروج وفروغ کے متمنی تھے مگر مجاہدانہ عزم وہمت سے محروم تھے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہیں مگر آرام کے ساتھ

۱۹۰۶ء میں جب سرسید احمد خان کی واضح ہدایت کے باوجود ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کے مقاصد میں بھی ایک واضح مقصد انگریز کی اطاعت کا تھا۔مسلمانوں کی طرف سے اگر کہیں کوئی مطالبہ پیش بھی کرنا ہوتا تو بڑے نرم ونازک الفاظ میں آئین کے دائرے کے اندر رہ کر کیا جاتا۔ یہ لوگ اپنے تمام تر کمالاتِ علم وحکمت، فضل وکمال، دانائی وپارسائی کے حاکم وقت کے ساتھ آویزش یا تصادم کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے اور نہ ہی انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے قومی مسائل کا اظہار کرسکتے تھے۔شاید یہی وجہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے مسلم لیگ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں　　ملک میں غلغلہ ، شور بھی ، کہرام بھی ہے
ربط ہے اس کو گورنمنٹ سے بھی، ملک سے بھی　　جس طرح صَرف میں اِک قاعدۂ ادغام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کا کوئی پوچھے ہم سے　　محسنِ قوم بھی ہے ، خادمِ حکام بھی ہے
مجھ سے آہستہ میرے کان میں ارشاد ہوا یہ　　سال بھر حضرت والا کو کوئی کام بھی ہے

ایسے حالات میں ایک جعلی نبوت کا اعلان انگریزی مفادات کی نگرانی اور آئندہ آنے والے حالات کی پیش بندی کے لیے مفید اور کارآمد ہوسکتا تھا۔سرسید احمد خان اور مولوی چراغ علی کے رشحاتِ قلم مسلمانوں میں ایسی فضا پیدا کرچکے تھے کہ غلام احمد قادیانی سے نبوت کا وعدہ ۱۹۰۱ء میں کرایا گیا۔مسلمانوں کی سیاسی زبوں حالی اور اقتصادی پستی میں اس نبوت کو آب ودانہ میسر آنا لازمی امر تھا۔انگریز سیاست دانوں نے اپنی سیاست کا یہ حربہ مسلمانوں کے خلاف صحیح وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ کہتے ہیں کہ کامیاب سیاست دان وہ ہے جو صحیح وقت پر وقت کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے صحیح فیصلہ کرے اور پھر اس پر ڈٹ جائے۔ انگریزوں کی یہ منصوبہ بندی اپنی جگہ ایک مضبوط منصوبہ بندی تھی۔ مگر قربان جایئے اللہ تعالیٰ کے جو سب سے بڑا منصوبہ بندی کرنے والا ہے اور جس کی منصوبہ بندی کے آگے کسی بھی فرعون وقت کی منصوبہ بندی نہیں ٹھہرتی۔ اسی تخریبی ماحول سے تعمیرِ نو کی کرنیں پھوٹنا شروع ہوئیں۔ مولانا حسرت موہانی کی سودیشی مال بائیکاٹ کی تحریک، ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال اور پھر ۱۹۱۱ء میں اس کی منسوخی کے اعلان نے حالات کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ یہ اعلان اگر چہ بظاہر مسلمانوں کی تذلیل اور توہین کا باعث تھا لیکن یہی اعلان بعد میں مسلمانوں کی تعمیر کا باعث اور وسیلہ بن گیا۔ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مچھلی بازار کی مسجد کو شہید کرنے کا واقعہ پھر اس کے بعد اٹلی کی طرف سے ترکوں کے خلاف جنگِ بلقان نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ قومی حمیت جاگ اٹھی اور اخوت کی روح بیدار ہونا شروع ہوگئی۔ شبلی نعمانی ترکوں کی حمایت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

زوالِ دولتِ عثماں ، زوالِ شرع و ملت ہے — عزیزو فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اُٹھے — تو پھر یہ احترام سجدہ گاہِ قُدسیاں کب تک
کہیں اُڑ کر دامانِ حرم کو بھی نہ چُھو آئے — غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید آ بگینوں کی نگاہیں ہوں — تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک
کہاں تک ہم سے لو گے انتقامِ فتحِ ایوبی — دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے ملک میں خشک سالی کا — ہم اپنے خوں سے سینچیں گے تمہاری کھیتیاں کب تک
مراکش جا چکا ، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ نیم جاں کب تک

جیسے ڈرامے کے دوران سین تبدیل ہوتا ہے۔ ہندوستان کی اس سیاسی کہانی کا ایک سین بدلا تو دوسرا اس سے بالکل مختلف اور جدا تھا۔ نہ وہ عجز و انکساری، نہ وہ تابعداری کی التجائیں، نہ سطوتِ شاہی کے ترانے، نہ ہی وہ منت و سماجت کی فضائیں۔ ایک درد، ہمت، للکار، عزم، اخوت، درسِ حُریت کا سبق، اک انوکھا رنگ روپ، رمق دمق۔ سین کیا بدلا فضا ہی بدل گئی اور اس فضا میں کردار بھی بدلے۔ رہنما بھی بدل گئے، سرسید احمد خان، نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، مولوی چراغ علی کی جگہ اب شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، علامہ اقبال، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی اور سید سلیمان ندوی سامنے آ گئے۔

۱۹۱۴ء میں مولانا شوکت علی نے انجمن خدام کعبہ کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں میں روح جہاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۱۵ء شیخ الہند مکہ تشریف لے گئے۔ وہاں کے ترک گورنر غالب پاشا کو برطانیہ کے خلاف صف آرا ہونے کی ترغیب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلائی۔ مولانا سندھی کابل گئے اور امیر کابل کو برطانیہ کے خلاف جہاد کی طرف توجہ دلائی۔ یہی تحریک بعد میں ریشمی رومال کے نام سے منسوب ہوئی جب برطانیہ کو ایسی سرگرمیوں کا علم ہوا تو بہت جلد یہ تمام اکابر پسِ دیوار زنداں ڈال دیئے گئے۔

۱۹۱۸ء میں اتحادیوں کو فتح نصیب ہوئی اور فتح کے پردے میں جو ذلت آمیز شرائط ترکوں سے طے ہوئی تھیں، ان شرائط کی وجہ سے انگریزوں کو ہندوستان کے مسلمانوں سے خوف تھا کہ کہیں ملک میں مظاہرے اور ہنگامے نہ شروع ہو جائیں۔ چنانچہ ''رولٹ ایکٹ'' پاس کیا گیا۔ جس کے تحت پولیس کو بے شمار ایسے اختیار دے دیئے گئے کہ جن کا استعمال کر کے پولیس جس وقت، جس کو چاہے گرفتار کر سکتی تھی۔ اس ایکٹ کے تحت گرفتار ہونے والے سے اپیل کا حق بھی چھین لیا گیا۔ اس رولٹ ایکٹ کے خلاف جا بجا مظاہرے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں میں خصوصاً اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ملک کی فضا انگریزوں کے اس کالے قانون کی وجہ سے مظاہروں سے لرز اٹھی۔ لاہور، قصور میں خون خرابہ ہوا۔ گوجرانوالہ کا ریلوے اسٹیشن جلا دیا گیا۔ امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا۔ سینکڑوں انسانوں کی لاشیں جلیانوالہ باغ کے جلسہ گاہ سے اٹھیں۔ ظلم واستبداد اپنی انتہا کو پہنچا، بے چینی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ جسے عرف عام میں نفرت کہتے ہیں۔ نفرت سے ہی انتقام کا جذبہ ابھرتا ہے اور اسی انتقام کا ایک حسین عکس تاریخ کے اوراق پر ثبت ہے۔ جسے رام محمد سنگھ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس نے انگلستان جا کر جلیانوالہ باغ کے سانحۂ خونچکاں کا انتقام ۲۰ سال بعد جنرل ڈائر کے سینے میں اپنے پستول سے گولیاں داغ کر لے لیا۔ اس مردِ حُر کا نام اودھم سنگھ تھا۔ مگر جب عدالت میں اس کا نام پوچھا گیا کہ تیرا نام کیا ہے تو جواب میں اس نے اپنا نام رام محمد سنگھ بتایا اور کہا کہ میں تینوں حریت پسند قوموں (ہندو، سکھ اور مسلمان) کا نمائندہ ہوں۔ یہ تو ہندوستان کے حالات تھے۔ لیکن ان حالات سے پہلے بلادِ اسلامیہ میں جو کچھ انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا وہ ایک الگ لرزہ خیز داستان رنج والم ہے۔

۱۹۱۴ء میں ترک سلطنتِ عثمانیہ پہلی جنگِ عظیم میں شریک ہوئے تو ۴ رنومبر ۱۹۱۴ء کو برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ اس جنگ کے دوران مقاماتِ مقدسہ یعنی مکہ اور مدینہ محفوظ رہیں گے اور ان کے تقدس کو مجروح نہیں کیا جائے گا۔ مگر وہ وعدہ کیا جو وفا ہو جائے۔ ۱۹۱۶ء بارہ جنگی جہازوں کے ذریعے جدہ پر گولہ باری کی گئی۔ اسے فتح کر لیا گیا تو بعد میں کرنل ولسن کی قیادت میں برطانوی فوجیں مکہ معظّمہ پر حملہ آور ہوئیں اور ''جبل ابوقبیس'' پر اپنی توپیں نصب کر کے قلعہ ''جیاذ'' پر گولہ باری شروع کر دی گئی، قلعہ کی دیواریں ٹوٹ گئیں اور ترک فوج شہید ہو گئی۔ اس قلعہ کی فتح کے بعد جعدہ کا ترکی قلعہ محصور کر لیا گیا اور فاران کی مقدس چوٹیوں پر توپیں نصب کر دی گئیں اور جب ترکی کا یہ قلعہ بھی پیوند خاک ہو گیا تو ترک سپاہی مسجد بیت الحرام میں پناہ گزین ہو گئے لیکن انھیں بیت الحرام میں بھی پناہ نہ مل سکی اور انھیں عین کعبۃ اللہ کے اندر غلافِ کعبہ کے پاس شہید کر دیا گیا۔

جدہ، مکہ معظّمہ اور طائف کی تسخیر کے بعد جدہ کی طرف سے برطانوی فوجوں نے مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ مدینہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے اس وقت ترکوں کی جانب سے فخری پاشا گورنر تھے جو اپنی تقریباً دو ہزار فوج کے ساتھ قلعہ بند ہو گئے۔ برطانوی فوج نے مدینہ منورہ کا محاصرہ کرلیا اور گولہ باری کر کے مدینہ منورہ کے سینکڑوں شہریوں کو شہید کردیا۔ اسی واقعہ پر ضلع اعظم گڑھ کے مفتی منیر الحسن نے اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کیا:

تجھ سے فریاد ہے اے گنبدِ خضریٰ والے　　کہ تیرے رحم کے شایان تیری امت نہ رہی
للعجب دیں تیرا نرغۂ تثلیث میں ہے　　اپنی توحید کی تجھے یارب ضرورت نہ رہی
اب نہ بغداد ہے باقی نہ حجاز اور نہ شام　　حرمِ حضرتِ باری کی بھی حُرمت نہ رہی

جنوری ۱۹۱۸ء کو برطانیہ کے وزیراعظم جارج لائیڈ نے سرکاری طور پر اعلان کیا کہ ہم ترکوں سے اس لیے نہیں لڑ رہے کہ انہیں ان کے دارالحکومت یا ایشائے کوچک اور تھریس کی زرخیز زمین سے محروم کردیں، لیکن جب ۳ر نومبر ۱۹۱۸ء کو ترکوں نے التواء جنگ کے معاہدے پر دستخط کردیئے تو انگریزوں نے اپنے وعدے کے خلاف موصل کی طرف پیش قدمی شروع کردی اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلیا اور ۱۵ر مئی ۱۹۱۹ء کو یونانیوں نے جو انگریزوں کے اس جنگ میں اتحادی تھے نے ایشیائے کوچک اور تھریس کی زمینوں کو تاراج کرنا شروع کردیا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس موقعہ پر اپنے تأثرات اس طرح بیان کیے:

جاگ اے یثرب کی میٹھی نیند کے ماتے کہ آج
لٹ رہا ہے آنکھوں، آنکھوں میں تیری امت کا راج
سر چھپانے کو ٹھکانا بھی انھیں ملتا نہیں
لے چکی ہے جن کی ہیبت ایک عالم سے خراج

علامہ اقبال نے ترکوں کی بربادی اور یہودیوں کی ابھرتی ہوئی طاقت سے متأثر ہو کر یوں کہا ؂

ہوگئی رسوا زمانے میں کلاہِ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ہیں آج مجبورِ نیاز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیساء بن گئی خاکِ حجاز

اِنھی حالات میں ۲۲ر نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ چونکہ علمائے کرام نے مسئلہ خلافت کو قرآنی آیات کی روشنی میں ہندوستان کے کروڑوں مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ لہٰذا ہندوستان کے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ ان کے منجمد خون میں حرارت پیدا ہوگئی۔ تحریک کیا تھی انگریزوں کے خلاف نفرت کا سیلاب تھا۔ خلافت کمیٹی کی جانب سے ترکِ موالات کی اپیل پر ہزاروں مسلمانوں نے سرکاری سکولوں، کالجوں، عدالتوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا۔ ہندوستان میں بڑے وسیع پیمانے پر احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔ انگریزوں سے عدم تعاون کی بنا پر آغا محمد صفدر، مولانا عبدالقادر قصوری، احرار رہنما مولانا مظہر علی اظہر، ڈاکٹر محمد عالم، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، رانا فیروز الدین اور مولانا مظہر الحق نے بطور وکیل سرکاری عدالتوں میں پیش ہونا ترک کر دیا۔ مفکر احرار چودھری افضل حق نے اسی تحریکِ خلافت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی سحر انگیز خطابت سے متاثر ہو کر پولیس کی نوکری سے استعفیٰ دیا۔ ان کے علاوہ سلیم خان، محمد اکبر سیالکوٹی بھی پولیس کی نوکری چھوڑ کر تحریک میں شامل ہو گئے۔ احرار لیڈر صاحبزادہ فیض الحسن کے والدِ محترم سید محمد حسین شاہ نے آنریری مجسٹریٹی سے استعفیٰ دیا اور نہ جانے کتنے دوسرے لوگوں نے ان لوگوں کی تقلید میں ترکِ موالات کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے سرکاری ملازمتوں کو خیر باد کہا۔ خلافت کمیٹی کی رضا کارانہ تنظیم تشکیل دی گئی۔ سول نافرمانی کی اس تحریک میں اَسی ہزار مسلمان گرفتار ہوئے۔ تحریک کا آغاز اگرچہ دسمبر ۱۹۱۹ء سے ہو چکا تھا اور تحریکِ خلافت بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہی تھی۔ تاہم اس تحریک میں شدت اس وقت پیدا ہوئی، جب مولانا محمد علی جوہرؔ کا مشن انگلستان سے ناکام لوٹا۔ ۲۸ر مئی ۱۹۲۰ء کو الٰہ آباد کے مقام پر خلافت کمیٹی کے اجلاس میں فیصلہ ہوا کہ حکومت سے باقاعدہ عدم تعاون کیا جائے۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو مجلس خلافت کی اپیل پر ہندوستان بھر میں انگریزی استبداد کے خلاف اظہارِ نفرت کے لیے ہڑتال کی گئی۔ چھ ستمبر کو ایک اجلاس کلکتہ میں ہوا جس میں سرکاری تقریبات کا بائیکاٹ، قانون ساز اداروں سے استعفیٰ دینا، تمام سرکاری خطابات واپس کرنے اور سرکاری سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ کیونکہ حکومت نے مسلمانوں کے درج ذیل مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

(۱)　ترکی کے سلطان کی حکومت مسلمانوں کے خلیفہ کی حیثیت سے برقرار رکھی جائے۔

(۲)　حجاز، شام، فلسطین جہاں مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں، غیر مسلم اقتدار سے محفوظ رکھے جائیں۔

۸ر جولائی ۱۹۲۱ء کو کراچی میں مولانا محمد علی جوہر کی صدارت میں جلسہ ہوا۔ اسی کانفرنس میں مولانا نے اپنا تاریخی خطبہ دیا جس کی تائید میں ہندوستان بھر کے ۵۰۰ علماء کا فتویٰ بھی آپ نے پڑھ کر سنایا کہ انگریزی فوج میں بھرتی ہونا حرام ہے۔ آپ کی تقلید میں مولانا حسین احمد مدنی، پیر غلام مجدّد، مولانا نثار احمد نے بھی تقاریر کیں۔ بعد میں ان پر بغاوت کے الزام میں مقدمات قائم ہوئے اور انھیں دو، دو سال کے لیے قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی۔ تحریکِ خلافت ہی وہ تحریک ہے جس میں ایک انوکھا اور نرالا قافلۂ حریت سروں پر کفن باندھے اپنے گھروں سے نکلا اور بہت جلد مطلعِ سیاست پر ایک ایسے جذبۂ حریت کی شناخت بن گیا کہ جس کے بارے میں نظیریؔ نے کیا خوب کہا ہے:

گریزد از صفِ ما آنکہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست

اور علامہ اقبالؔ نے اس شعر پر نظیریؔ کو یوں داد دی:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہ ملکِ جم نہ دہم مصرعۂ نظیری را
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

اسی قبیلۂ حریت میں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بھی ہیں جنھیں تحریکِ خلافت میں مسجد خیرالدین امرتسر میں ایک باغیانہ تقریر پر ۳ سال قید با مشقت کی سزا سنائی گئی۔ ان کے تمام ساتھی مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا مظہر علی اظہرؒ، شیخ حسام الدینؒ، مولانا داؤد غزنویؒ، ماسٹر تاج دین انصاریؒ، چودھری افضل حقؒ تحریک خلافت میں پہلی بار پابند سلاسل ہوئے اور یہی لوگ تھے جنھوں نے قادیانیوں کے خلاف تبلیغ کی شکل کو تحریک کی صورت میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اِنھی حریت پسندوں نے ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو مجلس احرارِ اسلام کی بنیاد رکھی کہ جن کے کارناموں سے تحریکِ حریت کا دامن بھرا ہوا ہے۔ جن کی داستانِ حریت ایک ایسی داستان ہے جو کئی کتابوں پر محیط ہے۔ یہ سبھی لوگ سراپا صفات، اپنے اعمال و کردار میں یکتا و منفرد تھے۔ اِنھی لوگوں کے بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''ایسے لوگ صرف پیدا ہوتے ہیں مرتے نہیں۔''

ورنہ سقراط مر گیا ہوتا
اُس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں

عمر بھر سراپا جذب و شوق اور عشق و جنوں کا عنوان بنے رہے۔ جن کے دل میں امتِ مسلمہ کے زوال کا درد موجزن تھا۔ جو انھیں ہر لحہ بے چین و مضطرب رکھتا، وہ خود ہی درد کا درماں بنے رہے، اُن کے عزم و استقلال، شرافت و دیانت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ وہ دشمنوں کے لیے طوفانِ بے پناہ اور اپنوں کے لیے سراپا مہر و محبت تھے۔ انھوں نے خود اپنے لیے ایک کٹھن راہ چُن لی تھی، وہ اس کٹھن راہ پر بڑے حوصلے کے ساتھ رواں دواں رہے:

چُن لی تھیں میں نے آپ کٹھن منزلوں کی راہ
کاٹی ہے قیدِ زیست بڑے حوصلوں کے ساتھ

جنھیں کھلے پانیوں میں موجِ حوادث سے کھیلنے کا شوق ہوتا ہے، وہ کب ساحلوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ سکون ان کے لیے موت اور اضطراب زندگی بن جاتا ہے۔ اکابر احرار کو اپنے مؤقف کی صداقت پر لازوال یقین تھا جو انھیں بے پناہ اعتماد کی دولت سے مالا مال کر گیا۔ اُن کے ضمیر مطمئن تھے، تبھی وہ برطانوی استبداد اور اُس کی پیدا کردہ خباثت ''قادیانیت'' سے ٹکرا گئے۔ یہ ٹکراؤ اتنا شدید، اتنا وسیع اور اتنا انوکھا ٹکراؤ ہے کہ آنے والی مسلمان نسلوں کے لیے نشانِ منزل بن گیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال و سخن ہی نورِ ایمانی سے منور نہ تھا بلکہ دل و دماغ بھی اسی نور سے درخشاں تھے۔ ان کا حرف حرف گلِ پیرہن تھا۔ ان کے لب جب تلاوت فشاں ہوتے تو حور و طیور بھی وجد میں آ جاتے تھے۔ ان کے پیار کی خوشبو سے حریت پسند احرار کارکنوں کی نس نس مہک اٹھی تھی۔ ان کے خیال سرور آمد اور الفاظ گلاب و نسترن تھے۔ ان کے منہ سے نکلے ہوئے حروف کہکشاں بن کے سننے والوں کے دل و دماغ پر دمکتے تھے۔ یقیناً یہ قبیلۂ احرار صدق و صفا، مہر و وفا، جذب و عشق کا ایک استعارہ ہیں۔ جن کی نگاہ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنوں نے بے کمال لوگوں کو حسنِ کمال عطا کیا۔ جن کے مسلک میں عرضِ طلب گناہ ٹھہری، جن کی پوری زندگی فقر و غنا کے آسمان پر ماہِ منور کی طرح چمکتی دمکتی نظر آتی ہے۔ طالب آملی نے شاید اسی قبیلۂ حریت کے لیے کہا تھا:

بے نیازانہ ز ارباب کرم می گزرم
چوں سیاہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گزرد

یہ سب درویشِ فکرمست تھے، جن کے بارے میں اقبال نے کہا:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں ، بیگانے بھی ناخوش　　میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلۂ مسجد ہوں ، نہ تہذیب کا فرزند
درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے ، نہ غربی　　گھر میرا نہ دلّی ، نہ صفاہاں ، نہ سمرقند

یہ وہ درویشِ خدامست تھے کہ جن کی آستینوں میں تابشِ مہروماہ ،جن کے پاؤں کی ٹھوکر میں سطوت کج کلاہ اور لب پہ صدائے لا الہ ہوتی ہے۔

یہ چند سطور آنے والی کہانی کے پس منظر کے طور پر تحریر کی گئی ہیں، تاکہ قارئین حضرات بخوبی اس حقیقت سے آگاہ ہوسکیں کہ امتِ مسلمہ پر کس قدر کٹھن مرحلہ تھا اور خصوصیت کے ساتھ پاک و ہند کے مسلمان کس قدر مضطرب اور پریشان تھے۔ خلافتِ اسلامیہ کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ جب کہ قادیانی اس خلافت کو ڈھانے کے لیے یہودیوں اور نصرانیوں کے دست و باز و بنے ہوئے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے بعد حکیم نورالدین اور پھر ۱۹۱۴ء میں مرزا بشیرالدین محمود کی سربراہی میں بھی قادیانیوں کی خلافِ اسلام سرگرمیاں نہ صرف جاری رہیں بلکہ اپنے عروج پر پہنچ گئیں۔ جن کا تذکرہ اگلی قسطوں میں آپ بڑی تفصیل کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں گے۔ خصوصاً اس سیاسی اور تاریخی پس منظر کے بعد قادیانیوں کی امتِ مسلمہ کے خلاف سرگرمیاں زیادہ اُبھر کر آپ کے سامنے آئیں گی۔ جن پر یہ آج جشنِ صد سالہ منا رہے ہیں۔ اس کی اصل حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی:

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے

(جاری ہے)

محکوم کے اِلہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز
[اقبالؔ: ''ضربِ کلیم'']

© rasailojaraid.com